یہ معصیت کوشیاں اور عیش و عشرت کی یہ فراوانیاں! لیکن دوربیں نگاہیں خوب محسوس کر رہی تھیں کہ یہ درخشندگی چراغِ سحری کی آخری ٹمٹماہٹ ہے۔ یہ خیرگی جھوٹے نگوں کی میناکاری ہے یہ بظاہر صحت کے آثار موت سے پہلے کا سنبھالا ہے۔ وہ نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ جسم سے صالح خون ختم ہو چکا ہے اور۔

چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات (اقبالؒ)

چنانچہ **مہلت** کا یہ آخری وقفہ بھی ختم ہو گیا۔ جہنم اپنی پوری شعلہ سامانیوں سے ابھر کر سامنے آ گیا۔ (برزِ الجحیم) اور چاروں طرف سے ہلاکت و بربادی کا سیلاب امنڈ آیا۔

حذر! اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں! (اقبالؒ)

یورپ کے اجتماعی جرائم کی فہرست طول طویل ہے اور ان کی حقیقت نکھر کر سامنے نہیں آ سکتی تا وقتیکہ ان کے نظامِ حیات کا ایک ایک گوشہ بے نقاب نہ ہو لیکن اس اجتماعی فساد کے علاوہ اخلاقیات میں بھی ان کی حالت اس پستی تک جا پہنچی تھی جس کا تصور نا ممکن ہے۔ ہم چاہتے تھے کہ اس ضمن میں تہذیبِ یورپ کی کچھ مثالیں پیش کریں تاکہ وہ جدت پسند حضرات۔ جو ضوابطِ خداوندی کو عہدِ کہن کی پارینہ داستانیں قرار دیتے ہیں۔ خود دیکھ لیں کہ اخلاقی عناں تابیوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔ بارے الحمد کہ اس باب میں ہمیں کسی تردد و کاوش کی ضرورت نہ پڑی اور پرانے کاغذات میں طلوعِ اسلام کے کرم فرمائے خصوصی جناب پرویز صاحب کا ایک مضمون مل گیا جو انہوں نے آج سے پانچ چھ سال ادھر **مغرب کی خوفناک غلطی** کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ مضمون اس قابل ہے کہ اقتباسات کی بجائے مسلسل پڑھا جائے اسے ہمارے زیرِ نظر عنوان کی ایک کڑی ہی فرض کیجئے۔ مضمون یہ ہے۔

مغرب کی خوفناک غلطی اور اس کا ازالہ

یورپ نے مذہب کو تیاگ دیا، اور حقیقت یہ ہے کہ جو مذہب ان کے سامنے پیش کیا گیا تھا وہ تھا بھی اسی قابل کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس سے تبری و بیزاری کا اعلان کر دیا جائے، اس لئے کہ ایک ایسی قوم جس کی قوتِ

بازیۂ قلزم مادہ پرستی میں ساحل ناآشنا، اور جس کی ذہنی جولانگاہ فضائے سائنس میں حدود فراموش واقع ہوئی ہو! ایسے خدا کو لے کر کیا کرے جس کی "شاہنشاہیت میں مرفہ الحال انسان کے لئے کوئی جگہ نہ ہو" اور جس کی بارگاہِ جبروت و سطوت سے ہر جویائے علم و تحقیق کے لئے فتوائے موت صادر ہو جائے، دنیائے عمل میں اس مذہب کی تعلیم انھیں آگے ہی نہیں بڑھنے دیتی تھی، اس لئے وہ اسے کابیکاراں سمجھکر اس سے کنارہ کش نہ ہو جاتے تو اور کیا کرتے لیکن چونکہ **یورپ** کا ذہنی انقلاب نتیجہ تھا ہے کسی نہ کسی شدید ردعمل کا۔ اس لئے ان کی گاڑی جب کبھی کانٹا بدلتی ہے تو جادۂ اعتدال سے بہت دور جا پڑتی ہے۔ مذہب سے بیزاری اور علیحدگی کے وقت بھی ان سے یہ خطرناک غلطی ہوئی کہ بجائے اس کے کہ وہ یہ دیکھتے کہ قصور اس مذہب کا ہے جس کے مخصوص معتقدات کارزارِ حیات میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتے، وہ نفسِ مذہب ہی سے بیزار ہو گئے۔ جس کا فطری نتیجہ یہ کہ ہر چند انھوں نے مادیات میں ایسی ترقی کی کہ تاریخ عالم کے صفحات اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں، اخلاقیات میں وہ ایسے پچھڑے کہ اس کی مثال بھی ڈھونڈے سے نہ ملے گی، اور چونکہ نظامِ کائنات کا دار و مدار ان دونوں قوتوں کے بروئے کار لانے پر ہے، اور یہ قوتیں ایک پرندے کے دو بازؤں کے مشابہ ہیں (جن میں اخلاقیات یا روحانیت بمنزلہ دائیں بازو کے ہے) کہ ان میں سے اگر ایک بھی کمزور ہو جائے (چہ جائیکہ مفلوج) تو طائر فلک آشیاں گیر ہو کر رہ جائے، اور حسرتِ پرواز زبانِ حال سے کہہ رہی ہو کہ

صبا شکستہ پروں کی دعائیں لیتی جا — جھکا دے اور ذرا شاخ آشیانے کی

لہٰذا ان مطففین اور معتدین کے عدم توازن کی وجہ سے ان کا معاشرتی نظام کچھ ایسا بے طرح متزلزل ہوا ہے کہ اب سنبھالے نہیں سنبھلتا،

ذَالِكَ بِأَنَّهُمُ اتَّبَعُوا مَآ أَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوا رِضْوَانَهٗ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ (۴۷-۲۸)

یہ اس لئے کہ انہوں نے اس چیز کی پیروی کی جس نے خدا کو ناخوش کر دیا اور انھوں نے خدا کی رضا جوئی حاصل کرنے کو پسند نہ کیا، لہٰذا ان کے اعمال غارت ہو گئے۔

یورپ نے تو ٹھوکر کھائی تھی، لیکن افسوس آتا ہے ان روشن خیال مسلمان حضرات پر جن کے نزدیک **یورپ** کا ہر قول و فعل وحی ربانی سے بڑھ کر واجب العمل ہوتا ہے، ان کی دیکھا دیکھی انھوں نے بھی میاں کی سے کہنا شروع کر دیا کہ ہم تو کامل غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مسلمانوں کی نکبت و افلاس اور ذلت و مسکنت کا واحد سبب ان کا مذہب ہے، جب تک یہ اس حدیث پارینہ کو خیرباد نہیں کہتے دنیائے جدید میں ان کا کوئی قدم آگے

نہیں پڑھ سکتا"، حالانکہ ان کے کامل غور وخوض، اور مکمل ریسرچ کی حقیقت صرف اس قدر ہوتی ہے کہ اگر گراموفون یورپ میں رکھا ہوتا ہے اور ریکارڈ یہاں بجتا ہے۔

ع کوئی چمن نہ ملا جس کی وہ بہار ہیں یہ

دیکھنا یہ ہے کہ

(۱) مذہب کو چھوڑ کر یورپ کی اخلاقی حالت کیا ہو گئی،

(۲) کیا مذہب (اسلام) مادی ترقی کا مانع ہے؟

(۳) اسلامی ترقی اور مغربی ترقی میں کیا فرق ہے؟

مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے تہذیب اور اخلاق کے مختلف معانی ہیں، لیکن ہمارا مقصد تہذیب سے وہ نصب العین حیات ہے، جس کے ماتحت کسی قوم کے مخصوص ترکیبی عناصر مثل تمدن و معاشرت، صنائع و حرف سیاستِ مدن اور تدبیر منازل متشکل ہوتے ہیں، اور اخلاق سے وہ عالمگیر مفہوم مراد ہے جو ملکاتِ فاضلہ اور عاداتِ جمیلہ کا تصور ذہن نشین کرانے کے لئے مستعمل ہوتا ہے،

ہمارے نئے اخلاقیین" (جو تزکیۂ نفس اور اصلاحِ قلوب کے لئے مذہبی اعمال و عقائد کی ضرورت نہیں سمجھتے) کا اس باب میں عروۃ الوثقی یہی ہے کہ تہذیب اخلاق کے لئے سوسائٹی کے قوانین ہی کافی ہیں، لیکن وہ اس حقیقت پر نظر نہیں رکھتے کہ سوسائٹی کی نظر تو محض ان اعمال و افعال پر پڑ سکتی ہے، جو سوسائٹی کے مشاہدات میں آجائیں، لیکن قلبِ انسانی جو حقیقی سرچشمہ ہے ان اعمال و افعال کا، سوسائٹی کی ظاہر بیں نگاہوں کی گرفت میں نہیں آسکتا اور حقیقت یہ ہے کہ اعضاء جوارح کے اعمال نظامِ کائنات میں اس قدر بے اعتدالی پیدا نہیں کرتے جتنے قلبی رجحانات اور ذہنی تغیرات،

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں دنیا مرا دل ہے   بدل جانے سے اس کے رنگ ہر اک چیز کا بدلا

مذہب اپنے آپ کو علیم بذات الصدور اور مقلب القلوب کی طرف سے پیش کرتا ہے، وہ اعمال و رسوم کے پہلے نیتوں اور ارادوں پر نظر رکھتا ہے۔ اور کسی ارادے کے عمل میں آنے سے پیشتر اس کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے، مذہب اور سوسائٹی کے قوانین و تدابیر انسدادِ اعمالِ رذیلہ میں یہ ایک ایسا بین فرق ہے جو زیادہ دقتِ نظر کا محتاج نہیں۔ وفیھا بصائر للناس

علاوہ ازیں اخلاقِ جمیلہ، محض عاداتِ رذیلہ سے اجتناب کا ہی نام نہیں، بلکہ اس کے بعد اعمالِ حسنہ کا

اکتساب بھی ضروری ہے، سوسائٹی کے مسلّمات اپنی جگہ کیسے ہی صحیح یا مؤثر کیوں نہ ہوں تاہم زیادہ سے زیادہ انسدادِ افعالِ شنیعہ ہی اُن سے جیسا امکان میں ہوگا، ملکاتِ فاضلہ کی نشوونما اور انہیں دوسرے کار لانے کے لئے سوسائٹی کے پاس کونسا حربہ ہے، زیادہ سے زیادہ نام کی شہرت، اور نمائشِ خلق، سوجو عمارت ان بنیادوں پر قائم ہوگی اس کا استحکام معلوم،

مذہب صرف برائیوں سے اجتناب اور پرہیزگاری کی تلقین ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس سے آگے عملوا الصالحات کی لاینفک شرط بھی عائد کرتا ہے، وہ اگر پہلے جذباتِ خبیثہ کی حدت کو اعتدال پر لانے کے لئے "شراب کافوری" تجویز کرتا ہے، تو اس کے بعد تقویتِ قلب (مومن) کے لئے "شربت زنجبیل" بھی اس کے نسخہ میں موجود ہوتا ہے، اور مقصد ان تمام اعمالِ صالحہ کا شہرت نام نہیں بلکہ ابتغاء مرضات اللہ قرار دیتا ہے، جو تمام فانی مقاصد سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ سوسائٹی نام ہے افراد کے مجموعہ کا، اور افراد کی طبائع کا یہ عالم کہ جب کوئی عادت راسخ ہو جائے تو بلا قصد و ارادہ خود بخود سرزد ہوتی رہتی ہے، اور آہستہ آہستہ اس کی برائی تک محسوس نہیں ہوتی ایسی برائیاں جب سوسائٹی کی اکثریت میں حلول کر جائیں تو ان کے عیوب نگاہوں میں کھٹکتے ہی نہیں، بلکہ تدریجاً یہی چیز جب فیشن (روش مروجہ) میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کے عیوب محاسن میں شمار ہونے لگ جاتے ہیں، جب کسی برائی کی یہ کیفیت ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس کی اصلاح اس سوسائٹی کے افراد کے ہاتھوں کیسے ممکن ہے غور سے دیکھئے تو یورپ کی تہذیب کا آج یہی نقشہ ہے، جس چیز پر انگلی رکھئے، ہمارے اخلاقیین اسے مغرب کا مخصوص تمدن کہہ کر بزعم خود اس کی تمام سیئات کو مبدل بہ حسنات کر دیتے ہیں، حالانکہ اصولاً برائی جتنی عام ہوتی جاتی ہے اتنی ہی زیادہ خطرناک ہوتی جاتی ہے، چہ جائیکہ عام ہونے کی وجہ سے اسے حسنات کا لائسنس مل جائے قرآن حکیم نے بعثتِ نبوی صلعم کے وقت تہذیبِ عالم کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں یہی نکتہ ہے کہ ظهر الفساد فی البر والبحر یعنی خشکی تری، تمام روئے ارض پر فساد ہی فساد رونما ہو چکا تھا، کوئی چیز اپنی اصلیت پر باقی نہ رہی تھی، اور سوسائٹی میں عیوب عام ہو چکے تھے، بھلا فرمائیے ایسے میں انسانی افراد۔ ان افراد کے مجموعی دماغ، اور ان دماغوں کے وضع کردہ قوانین ان برائیوں کا استیصال کیسے کر سکتے ہیں، اس تو بر تو اندھیرے[لے]

لے سورۂ نور (۴۰-۳۹) ان کے اعمال ایک بحرِ زخار میں گھٹا ٹوپ اندھیرے کی طرح ہیں جہاں موج پر موج متلاطم ہو اور ان کے اوپر بادل، تو بر تو ظلمات اور اندھیرا ...."

کے لئے ایک ایسی شمعِ ہدایت کی ضرورت ہے جس کی کرنیں سوسائٹی کے تاثرات کے رنگین فانوس سے چھن کر نہ نکلیں بلکہ اس کا تجلّیٔ تنویر وہ سراجاً منیرا ہو جو انسانی فضاؤں سے بلند و بالاتر ہو،

اخلاقِ رذیلہ کی تفصیل یوں تو بہت طویل ہے، لیکن ان میں کچھ اجزائے مشترکہ ایسے بھی ہیں جنھیں ہر تہذیب و معاشرت نے ام الخبائث قرار دیا ہے، مثلاً شراب خوری، قمار بازی اور زناکاری۔ آیئے پہلے انھیں تین عنوانوں سے اس داستانِ رنگین پر سرسری نگاہ ڈالیں اور اس تصویر کا نظارہ اپنی عینک سے نہیں بلکہ خود اہلِ یورپ کی مہیا کردہ آنکھوں سے کریں کیونکہ سب سے معتبر شہادت مِن اَھلِہا (سورۂ یوسف) ہوا کرتی ہے۔

شراب خواری | خمخانۂ مغرب کے متوالے اکثر کہا کرتے ہیں کہ ہما[illegible] یورپ میں

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو

وہاں تو صرف ایک آدھ گھونٹ، **اوقاتِ معینہ پر محض بطورِ ٹانک** (مقویات[1]) استعمال کی جاتی ہے، لیکن ذرا سنیئے کہ رندانِ بلانوش کا خود اس سے متعلق کیا بیان ہے:

ڈاکٹر الفرڈ سالٹر جو ایک مشہور ڈاکٹر، ماہرِ امراض اور حکومتِ **برطانیہ** کی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں، ۱۴ مئی کو **گلاسگو** میں تقریر فرماتے ہوئے بتاتے ہیں کہ

> "شراب پارٹی (لیبر پارٹی) کے اکابر کو برباد کر رہی ہے، شراب پیئے ہوئے لیبر ممبر پارلیمنٹ میں ہر رات دیکھے جا سکتے ہیں، کچھ ممبر ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو اٹھ کر سگرٹ نوشی کے کمرے میں چلے جاتے ہیں، اور وہاں جا کر اتنی پیتے ہیں کہ بدمست ہو جاتے ہیں، وزرائے سلطنت تک ایسی حالت میں پارلیمنٹ کے اندر آتے ہیں کہ کھڑے بھی نہیں رہ سکتے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر موصوف نے پریس کے ایک بیان کے دوران میں فرمایا کہ

"میں نام بنام ایک ایک ممبر کو بتا سکتا ہوں، بلکہ ایک بار تو میں خود ایک ممبر کو پکڑ کر موٹر تک لے گیا تھا:"

انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ

---

[1] ہمارے مغرب زدہ ممالک کے مجددینِ ملت اسی بات سے سند لیکر شراب کو بطور دوائی استعمال کرنے کے جواز کا فتویٰ صادر فرما دیتے ہیں اور (WINCARNESS) (جس میں ایک تہائی شراب خالص کی آمیزش ہوتی ہے) تو آجکل بلاتامل پیا جاتا ہے اور بڑے بڑے معتبر حلقوں سے اس ام الامراض کے عین شفا ہونے کے سارٹیفکیٹ عطا ہوتے رہتے ہیں، ذالک رجس من عمل الشیطٰن

میں نے اسپیچ میں لیبر ممبروں کا ذکر کیا، اس سے یہ مراد نہیں کہ قصور وار صرف لیبر ممبر ہی ہیں، ہم کو غرض اپنی پارٹی سے ہے، دوسری پارٹیوں والے خود اپنے افعال کے ذمہ دار ہیں۔"

ان کا بیان ہے کہ

"جتنا خرچ دودھ، روٹی، کرایہ مکانات ودیگر اشیائے ضروری پر ہوتا ہے اس کے مجموعے سے بھی زیادہ شراب پر ہوتا ہے۔"

اور ایک اور سرکاری بیان کے مطابق تو تقریباً ۱ ارب ۴/۳-۸، کروڑ روپیہ سالانہ برطانوی قوم صرف شراب پر صرف کرتی ہے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے، یہ جہلا کی جماعت کا ذکر نہیں، عوام الناس کا تذکرہ نہیں۔ بلکہ خیر سے ان ممتاز اشخاص کا ذکر ہے جو تہذیب و تمدن کے علمبردار ساری قوم کے بہترین دماغوں کا نچوڑ، اور حکومت کے ارباب حل و عقد ہیں کہ جن کی کثرت آراء سے قومی قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں، اور جن کے وضع کردہ قوانین سوسائٹی کے قانون کہلاتے ہیں،

اور پھر یہ پونے تین ارب روپیہ سالانہ کا خرچ بھی ملاحظہ فرمایا! ان حقیقتوں کے سامنے تو مشرق کے افسانے بھی مات ہیں، مشرقی شاعر کے شہپر تصور نے ایسی ہی بلند پروازی کی تو یہ کہ

یوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار　　یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے،

اور راستے ہی میں دیوالہ پٹ گیا کہ

صرف بہائے مے ہوئے آلات میکشی،　　تھے یہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

لیکن مغربی اعداد و شمار کے سامنے تو عمر خیام اور حضرت ریاض کی خمریات بھی پھیکی پڑ گئیں،

اور سنیئے

لندن کے ایک معززاہل قلم مسٹر **ٹیلر کرافٹ** نے حال ہی میں ایک کتاب (CLOVEN HOOF) کے نام سے شائع کی ہے جس میں اہل لندن کی معاشرتی اور تمدنی زندگی کے اصلی خط و خال نمایاں کئے ہیں، اس میں وہ رقمطراز ہیں کہ

"مے نوشی کی رسم اتنی قدیم ہے اور شعر و ادب نے اسے اس قدر رنگین بنادیا ہے کہ انگریزی قوم میں یہ عیب کوئی عیب ہی نہیں رہا، بلکہ لوگ اسے ہنر سمجھنے لگ گئے ہیں اور ایسا جوہر کہ

بغیر اس کے گویا مردانگی میں فرق ہے۔"

دیکھ لیجئے، عیوب کے عام ہونے سے عیب ہنر بن گیا! ڈھونڈیئے اب سوسائٹی میں مصلحین کو۔

مینوشی کی اس عمومیت سے ان کی معاشرتی زندگی پر جو جہنم زا اثر ہوا اس کا اندازہ مسٹر مویؔ کے ان الفاظ سے لگ سکتا ہے، جو انھوں نے کلکتہ "روٹیرین کلب" کے ہفتہ وار جلسہ میں اواخر مئی ۱۹۳۳ء میں کہے، ان کا بیان ہے کہ

"واقعات طلاق کی بہت بڑی تعداد کی ذمہ داری شراب نوشی ہی پر ہے، خواہ وہ شراب نوشی افراط کی حد تک نہ بھی پہنچی ہو" (اسٹیٹسمین یکم جون)

ان اقتباسات پر ایک دفعہ اور نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ یورپ کی ساری

فضا کی گود میں میخانے تھرتھرائے ہوئے

دکھائی دیتے ہیں یا نہیں، جس قوم کے عناصرِ حیات میں ام الخبائث اس درجہ سرایت کر چکی ہو اس کے اخلاقیات کے متعلق کچھ بھی کہنا تحصیل حاصل ہے۔

قمار بازی | قدامت پسند مشرق اپنے عیوب و جرائم میں بھی کوئی جدت نہیں پیدا کرسکا، لیکن قربان جائیے۔ مغربی ترقی کے کہ اپنے عیوب میں اس قدر اختراعات سے کام لیا ہے کہ ان کی یکسانی تنوع سے بدل گئی ہے۔ جو جوا پاسے اور گولیوں سے خلاف قانون اور خلاف تہذیب ہے، وہی جوا جب تاش کے پتوں سے کھیلا جائے اور برج (BRIDGE) نام رکھا جائے، اور مہذب سوسائٹی کا بہترین شغلہ بنے اس کے علاوہ کارنیوال اور گھڑدوڑ لاٹری اور ڈربی، اور پتہ نہیں اور کیا کیا طریقے اس قدر مروج اور عام ہو چکے ہیں کہ کھلے بندوں، سورج کی شعاعوں اور بجلی کی روشنی میں قمار بازی کا اندھیر مچ رہا ہے، اور کوئی تہذیب، کوئی قانون اسے عیب قرار نہیں دیتا۔

مسٹر شیلکرافٹ مذکور اپنی کتاب کے صفحہ ۴۳ پر رقمطراز ہیں کہ

"کہ انگریزوں کا من حیث القوم جواری ہونا تو ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ میرے خیال میں اگر قمار بازی کو معصیت قرار دیا جائے تو ہر انگریز اس میں اپنی توہین سمجھے اور اسے غصہ آجائے تمام تومولیں ہم ہی ایسے ہیں جن کے ہاں بجز اتوار گڈ فرائیڈے اور بڑے دن کے گھوڑ دوڑ سال بھر برابر ہر روز ہوتی رہتی ہے، اور اس موقع پر جو بازیاں لگتی ہیں چاہے وہ کتنی ہی قیود و شرائط کے ساتھ کیوں نہ ہوں ہر جگہ سے زیادہ کھل کر لگتی ہیں، یہ شغلہ ہماری قوم کے ہر طبقہ کا جزو زندگی بن گیا ہے............

خاص شہر لندن میں کوئی ایک لاکھ افراد تو ضرور ایسے نکلیں گے (علاوہ باضابطہ دلالوں اور ان کے عملہ والوں کے) جن کا ذریعہ معاش یہی ہے"

مذکورہ صدر **کلکتہ روٹیرین کلب** کے جلسہ میں **مسٹر وارن بولٹن** نے کہا کہ۔

"کلکتہ میں جتنے لوگ مے نوشی سے تباہ ہو رہے ہیں اس سے بڑھ کر گھوڑ دوڑ کے جوئے سے برباد ہو رہے ہیں" (اسٹیٹسمین یکم جون)

فرمائیے اب سوسائٹی کو کونسا قانون اس کا سد باب کرے گا۔
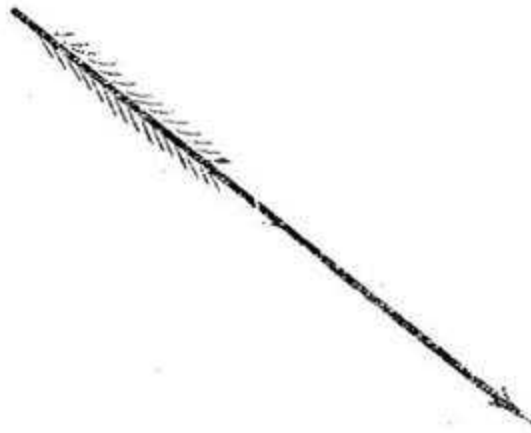
زنا کاری کثرت مے نوشی سے جذبات پر بہیمیت اس درجہ غالب آجاتی ہے کہ پھر خواہشات کی ناجوئی کے لئے جائز و ناجائز کی تمیز مشکل ہو جاتی ہے، اس پر بلحاظ تناسب عورتوں کی آبادی کی اس قدر اکثریت، پھر آزادی نسواں کی وجہ سے بیوی کی کفالت اس قدر گراں کہ ایک بھلے آدمی کی متوسط آمدنی اس کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی، ان حالات کے ماتحت تدریجاً نظام نکاح کی رسم ہی اٹھتی چلی جا رہی ہے، ادھر ضبط تولید کے آلات و ادویات نے رہا سہا خدشہ بھی مٹا دیا، نتائج ظاہر کہ

"ز ہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو"

خاص شہر **لندن** میں عام بے عصمتی سے قطع نظر ان مخصوص کسبیوں کی تعداد بقول **مسٹر ٹیلر کرافٹ** مذکور ۴۰ ہزار ہے جو باضابطہ لائسنس حاصل کئے ہوئے ہیں، ان کے محبوب مشاغل علاوہ **عصمت فروشی** کے یہ ہیں:

"نشیلی دواؤں کا استعمال، شرفا کو دھمکا کر ان سے روپیہ وصول کرنا، مخبری کرنا، ناجائز شراب کی تجارت کمیشن وصول کرنا، اور جیب کاٹ لینا، گویا بیسوا ہونا، اور جرائم پیشہ ہونا کچھ اس

طرح لازم و ملزوم ہو گیا ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا دشوار ہے۔ (CLOVEN HOOF)
علاوہ بریں عیاشی کے غیر طبعی طریقے بے حد عام اور مروج ہو رہے ہیں، جو عورتیں عورتوں کی طرف میل رکھتی ہیں ان کی تعداد مسٹر ٹیلر کرافٹ کے الفاظ میں "خطرناک حد سے زائد ہے" اسی طرح صاحب موصوف نے اس حقیقت کا بھی انکشاف فرمایا ہے کہ

"یہ تو عرصہ سے معلوم تھا کہ لندن میں خاص انہی اغراض کے پورا کرنے کے لئے مستقل عمارتیں موجود ہیں لیکن حال ہی میں ایک مقدمہ کے دوران میں اس کا علم ساری پبلک کو ہو گیا"۔ (ص ۹۲۔ ایضاً)

اس کے بعد مصنف موصوف نے عیاشی کے ایسے مکروہ اور گھناؤنے طریقوں کا ذکر کیا ہے جن کا تصور بھی ذوق سلیم برداشت نہیں کر سکتا، صنف نازک کا جذبات پرستی کے سبب انسانوں سے گذر کر جانوروں تک پہنچنا فحش کاری کا ایسا واقعہ ہے کہ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔
خواہشات کا یہ باب صنف نسواں تک ہی بند نہیں ہو جاتا بلکہ مردانہ بےحیائی کی تصویریں بھی (جو شہر سدوم کی داستانِ پارینہ سمجھی جاتی ہیں) وہاں متحرک نظر آتی ہیں، چنانچہ اس کے لئے بھی متعدد کلب اور سوسائٹیاں موجود ہیں جن کے سرپرست

"اسکولوں کے ماسٹر گرجوں کے پادری اور اسکاؤٹ ماسٹر حضرات ہیں" (ص ۹۲۔ ایضاً)

ان تمام تفصیلات سے مقصد یہ نہیں کہ کسی خاص فرقہ، قوم یا ملک کے اخلاقیات کی تصویر کا سیاہ رخ نمایاں کر کے ان کے خلاف نفرت کے جذبات ابھار دیئے جائیں، بلکہ مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب جذبات سفلی کے حدود و قیود توڑ کر انہیں آزاد نہ چھوڑ دیا جائے تو پھر "سیلاب نہ پرسد کہ در خانہ کدام است" جذبات بہیمیہ کو ضرور کسی نہ کسی قاعدے اور ضابطے کے ماتحت رکھنا پڑے گا، اور وہ قواعد انسانی دماغ یا تاریخی تجارب کا نتیجہ نہ ہوں گے بلکہ اس ہستی مطلق کے مرتب فرمودہ ضوابط ہوں گے، جو انسانی سرشت اور اس کے رجحانات سے خوب واقف ہو۔
یہ بھی نہیں کہ یہ اخلاق رذیلہ سوسائٹی کے کسی ذلیل طبقہ سے ہی متعلق ہیں بلکہ عالت یہ ہے کہ جب خواہش کاری اس حد تک عام ہو جائے، جب زندگی کا مفہوم ہی جذبات پرستی قرار پا جائے تو آہستہ آہستہ سوسائٹی سے فحش کاری کی برائیوں کا احساس اٹھ جاتا ہے امریکہ میں بچوں کے اخلاق کی نگرانی کی خاطر ایک انجمن قائم ہے، اس نے عدالت میں دعوےٰ دائر کیا کہ فلاں مرد و عورت بلا نکاح رہ رہے ہیں اور اس کا اثر ان کے چار سالہ بچے کے اخلاق پر پڑتا ہے، عدالت نے فیصلہ صادر فرمایا کہ نہیں اس سے بد اخلاقی کا کیا خطرہ، وہ تو جب تھا کہ مرد و عورت

کسی نفضیحتے سے رہتے ہیں، چنانچہ قانونی نقطۂ خیال سے بھی محض زنا کوئی جرم نہیں تاوقتیکہ ان کا شماران امور میں نہ ہو، جو "تکلیف عامہ" پبلک نیوسنس" کا باعث ہوتے ہیں۔ اسی طرح محض "تفنن طبع" کے لئے کسی غیر مرد سے آشنائی پیدا کرلینا بھی وہاں کوئی جرم نہیں کیمبرج کے ایک دوکاندار کی بیوی نے ایک مقامی ڈاکٹر سے راہ و رسم پیدا کرلی، دوکاندار نے ڈاکٹر صاحب کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا اور عدالت عالیہ کے جج مسٹر میکارڈی نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ بیوی شوہر کی غلام نہیں ہے اسے بھی اپنی پسند کے مطابق مردوں سے دوستی کرنے کا حق حاصل ہے۔

جب خانگی زندگی کی یہ حالت ہو جائے تو عصمت فروش طبقہ کی آزادی کا خود قیاس فرما لیجئے، ابھی کچھ دن ہوئے یہ خبر گشت کر رہی تھی کہ بمبئی کارپوریشن زنانِ بازاری کو شہر سے نکال دینے کی تجویز پر غور کر رہی تھی لیکن حکومت بمبئی نے جواب دیا کہ یورپ کے بڑے بڑے متمدن شہروں نے بھی ایک عصمت فروش طبقہ کی ضرورت محسوس کرلی ہے اور وہاں بازار حسن شہر کے اندر ہی ہوتا ہے لہٰذا اگر بمبئی میں انھیں شہر بدر کر دیا گیا تو یہ فیصلہ جدید تمدن کے خلاف رجعت پسندی کے برابر ہوگا۔

جب شہروں کی مہذب آبادی کی یہ حالت ہے کہ زناکاری بھی ضروریات معاشرت میں سے تسلیم کی گئی ہے، تو فوجی زندگی جو اپنے سپاہیانہ پن کے لئے پہلے ہی بدنام ہے، اس کا کیا حال ہوگا، مشتے نمونہ از خروارے سن لیجئے کہ فرانسیسی فوج کا جو حصہ "فرنچ فارن لیجن" کے نام سے نامزد اور اپنے ضبط و نسق کی سختیوں کے اعتبار سے ضرب المثل ہے اس کی جو پلٹنیں فاس میں متعین ہیں، ان میں ایک انگریز جنٹ مسٹر میک ہنری نامی پانچ سال تک ملازم رہا ہے، اس نے اپنے مشاہدات حال ہی میں شائع کئے ہیں، جنمیں وہ لکھتا ہے کہ

"یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ ہم لیجن والوں کو خاص پیشہ کی عورتوں کی کوئی کمی نہیں، چنانچہ فاس (مراکش) میں ایک پورا محلہ ان سے آباد ہے جنمیں کوئی تین ہزار عورتیں ہونگی اور ہر نمونہ اور ہر قوم کی، اور چھوٹی سے چھوٹی چوکی پر بھی دو تین ایسی عورتیں ضرور رہتی ہیں"

(نشال اینڈ وٹائزر - ۱۰ جون)

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پبلک ہیلتھ کمشنر کی سالانہ رپورٹ کے مطابق ۱۹۲۶ء میں مرض آتشک میں مبتلا ہو کر اسپتال میں داخل ہونے والے دیسی سپاہیوں کی اوسط فی ہزار ۱۵٫۷ اور گوروں کی ۱۴٫۷ تھی، (ماڈرن ریویو نومبر ۱۹۲۷ء)

ثمراتِ تمدن یہ تو تھا مختصر سا تذکرہ ان تین عنوانوں کے تحت جنھیں خالصتہً اخلاق سے تعلق ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اخلاقی حالت کے علاوہ مادی ترقی کی برکات کا ان کی عام معاشرتی زندگی اور زندگی کے سکون اور امن پر

کیا اثر ہوا اگر یہ درست ہے کہ درخت اپنے پھل ہی سے پہچانا جاتا ہے، تو مذہب کو تیاگ کر جو مادی ترقی حاصل کی گئی ہے اس کے نتائج سے اس کے حسن و قبح کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکے گا، سب سے پہلے یہ متعین کر لینا چاہیے کہ انفرادی و اجتماعی، ملکی و ملی تگ و دو حیات اور جد و جہد زندگی سے مقصد کیا ہے؟ مادی ترقیات کا، خدا کی زمین پر بسنے والوں پر جو احسان عظیم ہے، وہ کن معنوں میں احسان ہوگا؟ ہمدردانِ بنی نوع انسان یعنی مفکرینِ امم اور مصلحینِ ملل نے اپنے پیہم تدبر و تفکر سے جو حیرت انگیز انکشافات کئے ہیں، دنیا میں رہنے والوں پر ان کا کیا اثر ہونا چاہئے، ظاہر ہے کہ ان تمام سوالات کا ایک ہی جواب اور ان تمام خوابوں کی ایک ہی تعبیر ہو سکتی ہے، یعنی یہ کہ انسان کا جو قدم اس دنیا میں اٹھے وہ اس غرض سے اٹھے کہ اس سے بنی نوع انسان کے سکونِ قلب اور جمعیتِ خاطر میں کچھ اضافہ ہو، دماغ سوچیں تو اس لئے کہ مصائب و آلامِ ارضی و سماوی کا حل کیا ہے اور ہاتھ اٹھیں تو اس غرض سے کہ وہ اس سیلابِ بلا کو روکیں جو نوعِ انسانی کے امن و مسرت کو تہ و بالا کرنے کے لئے امڈتے چلے آ رہے ہیں، ترقیات کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ اس جہاں میں ہر سو خوشیوں کے چشمے ابلنے لگیں، مسرتوں کے دریا بہہ رہے ہوں، سکونِ قلب کی بارشیں ہوں، طرب و سرور کی ہوائیں چلیں، سائنس کی کرشمہ سازیاں اگر بجلی کے شرارے پیدا کریں تو ظلم و فساد کے خرمن کو جلانے کے لئے اور شینیں اگر آلاتِ حرب جدید اصولوں پر مہیا کریں تو جبر و استبداد کے انسداد کی خاطر، غرضیکہ ذہنی و دماغی قوتیں بڑھیں تو امن و سکون کی فضا پیدا کرنے کے لئے نہ کہ اس جنتِ ارضی کو جہنم زار بنانے کی خاطر،

تو کیا موجودہ تمدن نے یہی نتائج پیدا کئے ہیں؟ افسوس کہ واقعات اس کا جواب نفی میں دے رہے ہیں:

امریکہ جو آج تہذیبِ حاضرہ کا علمبردار اور مادی ترقیوں میں دنیا کا امام ہے، اس کی امن پسندی کی کیفیت یہ ہے کہ

سنہ ۱۹۳۱ء میں ایک سال کے اندر ۱۲ ہزار قتل ہوئے ۵۳ ہزار انسان موٹروں وغیرہ کے حوادث سے ہلاک ہوئے اور ۲۰ ہزار انسانوں نے خودکشی کی۔ (ماڈرن ریویو۔ دسمبر سنہ ۱۹۳۱ء)

جرمنی علم و فضل میں آج اپنی نظیر نہیں رکھتا لیکن وہاں بھی،

سنہ ۱۹۱۳ء میں خودکشی کرنے والوں کی سالانہ تعداد ۳، ۲۷، ۱۴ تھی اور یہ تعداد سنہ ۱۹۳۲ء میں ۱۶۰۰۰ تک پہنچ گئی۔ (رائیٹر۔ ڈیلی ایکسپریس لندن۔ ۲۲ مئی سنہ ۱۹۳۳ء)

یعنی جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی چلی جا رہی ہے انسان اپنی زندگی سے تنگ آتا جا رہا ہے، جنونِ خودکشی کے بعد اب جرائم کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے۔

سر ارنسٹ وائلڈ نے برطانیہ کے عدالتی اجلاس کے افتتاح کے موقعہ پر ستمبر ۱۹۳۲ء میں فرمایا کہ

"چوری، نقب زنی، رہزنی اور تشدد کی وارداتیں عموماً بڑھتی جا رہی ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ انگلستان میں آج قانون شکنی اس سے زائد ہے جو دو تین سال قبل تھی"

اسی طرح **امریکہ** میں ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۱ء تک کی تعداد جوڑنے سے معلوم ہوا کہ اس پانچ سال کے عرصہ میں ۷۰۰,۰۰۰ قتل کے واقعات پیش آئے ہیں۔ اور قتل عمد ملک میں ایک فن لطیف کی حیثیت حاصل کر رہا ہے"

(نیوز آف ورلڈ - ۱۶ اپریل ۱۹۳۳ء)

ادبی ترقی کا تعلق اخلاقی اصلاح سے نہ سہی، جسمانی صحت اور دماغی قوائے میں تو کچھ اصلاح ہونی چاہیے تھی، لیکن وہاں تو

نہ آں بیچارہ می سازی نہ با ما ساختی

کا مضمون ہے چنانچہ

"صوبہ متحدہ کے انگریزی علاقہ میں فی لاکھ ۲۳ اشخاص دیوانے نکلے اور دیوانوں کی یہ تعداد گذشتہ مردم شماری سے بہت زائد ہے، لیکن اس پر بھی برطانیہ میں دیوانوں کی تعداد میں جس سرعت سے اضافہ ہو رہا ہے، اس سے یہ کہیں کم ہے، ۱۹۱۱ء کی مردم شماری میں وہاں فی لاکھ ۴۸۴ اشخاص دیوانے تھے اور دیگر یورپی ممالک میں شرح دیوانگی اس سے بھی زائد ہے"

(لیڈر ۱۵ اپریل بحوالہ رپورٹ مردم شماری ۱۹۳۱ء)

اب اس دیوانگی کا باعث بھی ایک معتبر انگریز **مسٹر ٹرنر** کی زبانی سن لیجیے جو **صوبہ متحدہ** کی مردم شماری کے مرتب ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ

"یورپی ممالک کے مقابلہ میں اس صوبہ میں دیوانگی کی کمی کا بڑا سبب وہ پرسکون زندگی ہے جو عموماً یہاں کے باشندوں کو حاصل ہے۔ .... یہ مشہور و مسلم ہے کہ تمدن کی وسعت کے ساتھ ساتھ دیوانگی بھی بڑھتی رہتی ہے کہ اعصاب پر تمدنی حالات سے طرح طرح کا زور پڑتا ہے" (ایضاً)

یقیناً۔ اور اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ کسی شہر میں جا کر دیکھیے کہ اشیائے خوردنی و دیگر ضروریات زندگی کی دوکانیں اتنی نہ ہوں گی جتنی ڈاکٹروں اور دوا فروشوں کی، اب ذرا حوادث اتفاقی کا اندازہ فرمائیے،

سر لیو نارڈ ہل برطانیہ کے ایک نامور مدبر **ویکلی ٹیلیگراف** میں رقمطراز ہیں:۔

"جس چیز کا نام ہم نے حوادثِ اتفاقی رکھ لیا ہے اس کے ذریعہ سے ہر سال ملک میں ۲۰ ہزار نفوس سڑکوں پر ہلاک ہوتے رہتے ہیں اور کم از کم ۲ لاکھ کی تعداد میں زخمی، یہ ہولناک اتلاف جان واعضا کھلا ہوا نتیجہ ہے سائنس اور انجینیری کی ترقی کا جس پر ہم نے ہر چیز کو قربان کر دینے کا تہیہ کر رکھا ہے، فرض کر لیجئے کہ کسی غنیم سے ہمیں جنگ درپیش ہو اور اس میں ہر سال بیس ۲۰ یا تیس ۳۰ ہزار آدمی کٹنے اور ۷-۶ لاکھ زخمی ہونے لگیں تو ملک میں کیسی ہلچل مچ جائے (آبزرور ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۲ء)

ممکن ہے یہاں یہ اعتراض کر دیا جائے کہ جانوں کو بچانے کی ہی اگر فکر ہے تو پھر تو ترقی ہو چکی، پھر تو جین مت والوں کی طرح منہ پر کپڑا باندھ کر ننگے پاؤں پھرتے رہنا چاہئے کہ کہیں جیو ہتیا نہ ہو جائے، لیکن یہ اعتراض غلط نگہی پر مبنی ہے، جس چیز کی طرف ہم اشارہ کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ترقی کی دھن اور "مشینوں کی دنیا" میں مہذب انسان اس درجہ لاپرواہ ہو رہا ہے کہ اسے انسانی زندگی کی قیمت کا اندازہ ہی نہیں رہا، وہ اگر پرواکرتا ہے تو اپنے آرٹ اور سائنس کی خواہ اس تزئین وتحسین میں انسانی خون کی سرخی کی آمیزش ہی کیوں نہ ہو ایک مرتبہ **انگلستان میں** یہ سوال اربابِ فکر ونظر کے سامنے پیش ہوا کہ "فرض کرو کہ ایک کمرہ میں ایک انسانی بچہ اور ایک یونانی سنگ تراش کا ایک نادر روزگار مجسمہ رکھا ہے، کمرہ میں آگ لگ گئی ہے اور ان دو چیزوں میں سے صرف ایک ہی چیز بچائی جا سکتی ہے تو آپ کے خیال میں کس چیز کا بچانا ضروری ہے اس کے جواب میں بڑے بڑے مقتدر دانایانِ فرنگ کی اکثریت اسی طرف تھی کہ اس مجسمہ کو ضرور بچا لینا چاہیئے، کیونکہ بچے کا کیا ہے۔ بچے تو ہر روز پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارا مقصد اس ترقی کے خلاف لب کشائی کرنا نہیں بلکہ محض اس ذہنیت کو منظر عام پر لانا ہے،

سیاستِ مدن کا نقشہ آپ دیکھ چکے، اب ذرا اندرون خانہ بھی جھانکتے جایئے، کیونکہ اجتماعی زندگی میں تدبیر منازل بھی ترقی کا ایک خاصا معیار ہے،

لارڈ ڈاسنل نے ہاؤس آف لارڈز میں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا کہ۔

نفقۂ اہل وعیال کی عدم ادائی کی علت میں، انگلستان میں ہر سال اوسطاً دو لاکھ افراد ماخوذ ہو کر عدالت میں آتے ہیں اور ۷ ہزار جیل بھیجے جاتے ہیں۔

یہ ہے حسنِ معاشرت اور نظام معیشت،

قدامت پسند مشرق کو یہ طعنہ دیا جاتا ہے کہ ان کے ہاں شادی آن دیکھے، بے پرکھے آنکھ میچ کر کر دی جاتی ہے،

اس لئے اس کے نتائج خوشگوار نہیں نکلتے۔ اگرچہ یہ "طریقِ انتخاب" بھی اسلامی نہیں ہے، لیکن جس طریق افراط کو مغرب نے اختیار کیا ہے، اور وہاں جو شادیاں ٹھونک بجا کر کی جاتی ہیں، کیا واقعی خوشگوار نتائج پیدا کر رہی ہیں، اس کا جواب وہاں کے متفرد استیفاء طلاق سے مانگیے، اور جہاں طلاق کی بھی اجازت نہیں، یا اس کے حصول میں دقتیں پیش آتی ہیں، وہاں (MAINTENANCE ORDERS) (احکام نفقہ) کے قانونی شکنجہ میں جکڑے ہوئے انسانوں کی مشکلات سے اس کا اندازہ لگائیے، وہاں یہ حالت ہے کہ حسن و عشق کی داستانِ رنگین ابھی اپنا پہلا ڈراپ سین بھی ختم نہیں ہونے دیتی کہ اندھے کیوپڈ کے تیروں کی تلخ کامیاں شروع ہو جاتی ہیں اور دوسرے ہی دن زرِ مفارقت (SEPARATION ALL CE) کی ڈگری کی درخواست دینی پڑ جاتی ہے، چونکہ شادی کا یہ طوقِ تہذیب قانونی طور پر آسانی سے گلے سے نہیں اتارا جا سکتا اس لئے اس کے لئے طرح طرح کی ترکیبیں لڑائی جاتی ہیں، چنانچہ اے جی **گارڈنر** جو اس وقت **برطانیہ** کے بہترین اربابِ صحافت میں سے ہیں **جان بل لنڈن** کی ۱۱ فروری ۱۹۳۳ء کی اشاعت میں لکھتے ہیں کہ

"برطانیہ میں ایک بندھے ہوئے میاں بیوی ہیں، کچھ روز کے بعد ایک کا دل دوسرے سے ہٹ جاتا ہے اور دونوں آزاد ہونا چاہتے ہیں، لیکن قانون کی نظر میں یہ عدم موافقت بنائے طلاق نہیں ہو سکتی، طلاق جب ہی واقع ہو سکتی ہے جب بیوی کی بے عصمتی یا شوہر کا ظلم یا بدچلنی ثابت ہو جائے قانون سے مجبور ہو کر اثباتِ بدچلنی کی تلاش ہوتی ہے، شوہر ہوٹل میں جا کر کسی بیگانی عورت سے ہم بستر ہو جاتا ہے، اور اس کے گواہ پیدا کئے جاتے ہیں، جب جا کر عدالت کہیں اس کی گلو خلاصی کا حکم دیتی ہے، لیکن اگر اس اثنا میں سرکاری وکیل کو پتہ چل گیا کہ ساری کارروائی جعلی اور مصنوعی تھی اور واقعی بدچلنی نہیں ہوئی بلکہ محض حصول طلاق کے لئے "بدچلنی دکھائی گئی" ہے، تو حکم طلاق منسوخ ہو جاتا ہے، اور پھر وہ میاں بیوی قیدِ نکاح میں بیزار و برگشتہ جھگڑے کے جھگڑے رہ جاتے ہیں، یہ کوئی گھڑا ہوا قصہ نہیں بلکہ صدہا واقعات اسی طرح کے برابر ہوتے رہتے ہیں"

اسی طرح محض بیوی کے ہاتھوں تنگ آ کر خودکشی کر لینے کے واقعات کی خبریں بھی اخبارات میں گشت کرتی رہتی ہیں، جو فطرت کے خلاف جنگ کرنے کا لازمی نتیجہ ہے، تہذیبِ مغرب کا سب سے بڑا معرکہ آرا کارنامہ عورتوں کو پردہ سے آزاد کرانا ہے، لیکن اس مسلک میں بھی ان کی وہی اضطراری حالت جلوہ فرما ہوئی، پردہ اٹھا کر پھینکا تو اس زور سے کہ سترِ حیا لباس بھی ساتھ ہی الجھے ہوئے ایک طرف جا پڑے **جزائر انڈمان** کے وحشیوں

کے متعلق مغربی محققین بڑی حقارت سے لکھتے ہیں کہ

"وہ جسم کے پوشیدہ مقامات کو کسی درخت کے پتے یا کپڑے کی دھجی سے ڈھانک لیتے ہیں"

لیکن دیارِ تہذیب میں برہنہ ناچ، برہنہ سوسائٹیاں، برہنہ غسل، برہنہ آفتابی غسل، غرضیکہ بجلی کے قمقموں میں سمندر کے کنارے آفتابی شعاعوں کے نیچے مادرزاد برہنہ، جنسِ حسن کی نمائش، تہذیب و تمدن کے انتہائی دورِ عروج کی تاریخ جریدۂ عالم پر ثبت کر رہی ہے، اور پھر بڑے بڑے معزز صحائف میں بڑے بڑے شاندار عنوانوں سے اس ننگ سوز منظر کی تصاویر شائع ہوتی ہیں۔

تہذیب جدید کی ایک نئی پیداوار "مقابلہ حسن" بھی ہے، اب ذرا اس کے خوشگوار انجام کا حال بھی سن لیجئے"

مس بارکلے ۲۶ء میں آسٹریلیا میں ملکۂ حسن قرار پائیں، ۲۹ء میں زہر کھا کر خودکشی کرلی، مس ڈیوس کا ستارۂ حسن امریکہ میں چمکا، چند روز کے بعد دریا میں کود پڑیں، اور یہ لکھ کر چھوڑ گئیں کہ اب جینے کی ہوس نہیں، کنگسٹن کے ایک مشہور درزی خانہ میں ایک میم صاحبہ ملازم تھیں، تین سو پونڈ کی قیمتی پوشاک کی چوری کی علت میں گرفتار ہوئیں، معلوم ہوا چھ سال قبل یہ ملکۂ حسن رہ چکی ہیں، جس زمانہ میں مس پیرس پیرس میں وارد ہوئیں، عین اسی ہفتہ ایک سابق ملکۂ حسن نے زہر کھا کر مالدیویا میں خودکشی کرلی، وارسا کے مقابلۂ حسن میں دائرز بکس جب منتخب نہ ہوسکیں تو بندوق سے اپنے آپ کو ہلاک کرلیا۔

یہ واقعات افسانے نہیں ہیں بلکہ ایک انگریز خاتون **مارگریٹ گرے** نے **ڈیلی ایکسپریس** مورخہ ۲۸ ستمبر ۳۲ء میں شائع کئے ہیں، جو خاتمے پر لکھتی ہیں کہ

"امید ہے اس سے میری ہی لڑکیاں نہیں بلکہ ہر ماں کی لڑکیاں سبق لیں گی"

یورپ کو بڑا فخر یہ تھا کہ اس نے صنفِ نازک کو مساوی نہیں بلکہ مردوں سے بھی زیادہ حقوق دے رکھے ہیں، جس کی وجہ سے عورتیں بلا محابا اپنی فطری نزاکت اور جنسی لطافت کو چھوڑ چھاڑ کر مردانہ وار ان شعبہ ہائے حیات میں داخل ہوئیں، جو مردوں کے لئے مخصوص تھے، اور ہمارے ہاں کے مقتدی حضرات بھی ہماری اقتصادی بربادی کا سب سے بڑا سبب یہی بتاتے تھے کہ ہماری معاشی زندگی کا بہترین نصف حصہ (THE BEST HALF) عضوِ معطل ہے، لیکن **یورپ** نے تجربہ کے بعد جو نتائج حاصل کئے ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں،

ڈیلی ایکسپریس اپنی ۲ جون کی اشاعت میں لکھتا ہے:-

"ہٹلر (وزیر جرمنی) نے بیک گردش قلم عورتوں کو ان کے اصل مقام یعنی گھر گرہستی کی طرف واپس کر دیا ہے۔ اس نے فرمان جاری کر دیا ہے کہ یکم اگست تک کم از کم ۱/۲ ۱ لاکھ عورتیں کارخانوں کی ملازمتیں چھوڑ کر گھروں کو واپس چلی جائیں، خواہ بیوی کی حیثیت سے، خواہ خادمہ کی حیثیت سے"۔

یہی اخبار اپنی ۲ جون کی اشاعت میں رقمطراز ہے کہ

"امریکہ کی عورتیں اس وقت ایک بڑے نازک دور سے گزر رہی ہیں، جنگ کے زمانہ میں جن عورتوں نے کارخانوں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا وہ اب مجبور کیجا رہی ہیں کہ بے روزگار مردوں کے لئے جگہ خالی کریں، کفایت عامہ کی لہر نے ملک کے بہت سے گھرانوں کو ویران کیا، اور اس کے بعد اب ہر طرف سے یہ نعرہ لگنا شروع ہو گیا ہے، کہ عورت کی جگہ اس کا گھر ہے"۔

اسی طرح اگلے دنوں امریکہ کی سیاحت کے دوران میں اخباروں کے نمائندوں نے جب برنارڈ شاہ سے دریافت کیا کہ عورتوں کو حق رائے دہندگی ملنا چاہئے یا نہیں تو اس نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں، انگلستان میں عورتوں نے الیکشن کو ایک مذاق بنا دیا ہے"۔

یورپ اب اپنی اس حماقت کو محسوس کر چکا ہے جو اس نے عورتوں کو حدود فطرت سے آگے بڑھا دینے میں کی اور اب عورت کو واپس بلانا چاہتا ہے، لیکن اسے جناب کنفیوشس کا یہ قول یاد نہیں کہ عورت کا جو قدم ایک دفعہ آگے بڑھ جائے، اسے واپس لانا تو شاید قدرت کے بھی بس میں نہیں رہتا۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ صنف نازک کا جس قدر احترام یورپ کرتا ہے، اور ان کیلئے ہمدردی کے جو جذبات وہاں مردوں کے دل میں موجود ہیں، مشرق اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا، اور ان کا یہ احترام اور ہمدردی محض عورت کے عورت ہونے کی حیثیت سے ہے، فی الواقعہ بظاہر ایسا ہی نظر آتا تھا، لیکن مہذب انسانوں کی اس ملمع کاری کا راز بھی انہی کی ایک محترمہ نے کھول کے رکھ دیا، واقعہ دلچسپ ہے، ملاحظہ فرمایئے،

انگلستان کی ایک ۲۰ سالہ شوخ و شنگ نوجوان حسینہ کو ایک مذاق سوجھا، اور اخبارات میں فرضی نام سے یہ اطلاع شائع کرائی،

"میری عمر ۵۰ سال کی ہے، میں ہمیشہ بیمار رہتی ہوں، کیا کوئی خدا کا بندہ کسی رحمدل ڈاکٹر سے روشناس کرا سکتا ہے جو میری بیماری کا علاج کر سکے"۔

اس اعلان کے جواب میں صرف ۱۸ خطوط موصول ہوئے، جن میں زیادہ تر خطوط گرجوں کے پادریوں اور شفاخانہ

کی بوڑھی نرسوں کے تھے، اس کے چند روز بعد اسی عہدہ دار نے اخبارات میں یہ اعلان شائع کرایا،

"میں ایک نوجوان خوش جمال لڑکی ہوں اور تمام دنیا کا سفر کرنا چاہتی ہوں، مجھے ایک ایسے رفیق سفر کی ضرورت ہے جو میرا ہم عمر ہو، لڑکا ہو یا لڑکی اس کی کوئی قید نہیں، لیکن خوش جمال اور خوش مذاق ہو"

بس اب کیا تھا، صنفِ نازک کی مصیبت کے وقت کام آنے کے لئے مہذب انسانوں کے سینہ میں ہمدردی کے جذبات موجزن ہو گئے، ڈاک کا ایسا تانتا بندھا کہ ایک ہفتہ کے اندر گیارہ ہزار دو سو اکتیس خطوط کا ڈھیر لگ گیا

سرمن فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد

ان خطوط کے ڈھیر میں صرف ۱۳۱ خطوط عورتوں کے تھے، باقی تقریب گیارہ ہزار خطوط نوجوانوں کے جنہیں سے اکثر نے یہ بھی دریافت کیا تھا کہ

آپ تنہا سفر فرمائیں گی یا والدین بھی ہمراہ ہونگے؟ میری رفاقت کی شرط یہ ہے کہ والدین ہمراہ نہیں یہ ہے اس ہمدردی نسواں کا نمونہ جسے یورپین اخلاق کا طغرائے امتیاز کہا جاتا ہے،

جب گھر میں یہ حالت ہے تو باہر کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا، چنانچہ تہذیب جدید کا یہ اثر صرف خاک پاک **یورپ** تک ہی محدود نہیں، بلکہ جہاں جہاں بھی ان مہذب انسانوں کے **قدم** میمنت لزوم گئے ہیں، خیر سے بداخلاقی کے شجر خبیثہ کا تخم ساتھ ساتھ بوتے چلے گئے ہیں۔

ڈاکٹر اڈورڈ ویسٹر مارک اپنی مشہور کتاب بنی نوع انسان کے نکاح کی تاریخ" میں ضمناً لکھتے ہیں کہ :۔

"ایک قاعدہ عام جس کی کوئی استثناء نہیں ہے یہ ہے کہ اگر کالے آدمیوں (آسٹریلیا کے اصلی باشندوں) کا ایک گروہ سفید آدمیوں (یورپین) کی آبادی سے دور پایا جاتا ہے تو موخر الذکر جو زیادہ تر تاجر ہوتے ہیں محض بداخلاقی کی غرض سے ان بیبیوں سے دوستی پیدا کر لیتے ہیں۔ قبل اس کے کہ ان دیسی باشندوں میں ہیبت ناک بداخلاقیاں عام ہوں، میں ان سے ملا ہوں اور ان میں رہ چکا ہوں اور میں بلا خوف تردید کہتا ہوں کہ ان کی برائیاں تمام تر سفید آدمیوں کی بداخلاقیوں اور ان کی شرابخواریوں کا نتیجہ ہیں **مسٹر کیر** کا قول ہے کہ سفید آدمیوں کے داخل ہونے سے پہلے علاقہ وکٹوریہ کے اصل باشندے عام طور پر اپنی بیویوں اور بیٹیوں کی عفت و عصمت کو قائم رکھتے تھے، مگر پھر نہیں رکھ سکے"

گویا جسے جہالت و وحشت، بہیمیت و بربریت کہا جاتا ہے، اس میں تو پھر اخلاقی حالت اچھی تھی، لیکن اس ظلمت کدہ میں جب تہذیبِ جدید کی بجلی پہنچی تو اور بھی اندھیر ہو گیا، معلوم نہیں وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے اپنی "وحشت و بربریت" میں اچھے تھے یا اس تہذیبِ جدید کی روشنی سے منور ہونے کے بعد!

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

جس تہذیب و سوسائٹی کا دھندلا سا خاکہ یہ ہو اس میں جو سکون و طمانیت ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے آج میدانوں پر، پہاڑوں پر، خشکی پر، پانی پر، تحت الثریٰ سے اوج ثریا تک انسانوں کو اقتدار حاصل ہے، لیکن بایں ہمہ تسخیر و تجبر اور بایں ہمہ غلبہ و استیلا، انسانی دلوں کو ٹٹول کر دیکھ لیجئے، کسی ایک دل میں بھی اطمینان و امن کی رحمت نظر نہیں آئے گی کشاکشِ حیات اس قدر صبر آزما ہو چکی ہے کہ انسانوں کی اکثریت اس عذاب الیم سے موت کو بہتر سمجھتی ہے، انفرادی حالت دیکھنی ہو تو اپنے اپنے قلب کا جائزہ لیجئے اور گنئے کہ چوبیس گھنٹوں میں کتنے تا نئے طمانیت کے گذرتے ہیں، اجتماعی حالت کا اندازہ لگانا ہو تو یورپ اور امریکہ کے اربابِ بست و کشاد کی سراسیمگی کو توجہ میں لائیے، کہیں (PEACE CONFERENCES.) ہو رہی ہیں، کہیں امن سبھائیں بن رہی ہیں لیکن

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی (اقبالؒ)

بجلی کے پنکھے، پروں کے تکئے، حریر و اطلس کے گدیلے، فرشِ مخملیں، کمخواب کے پردے، مزین چار دیواری، مرصع چھت، پائیں باغ، اور باغ میں سرسبز و شاداب پودے، خوشنما پھول، آبِ جو اور اس میں تیرتے چاندی سونے کے برتن غلمانِ مخلدون، نازک اندام حسینانِ برق وش، لذیذ و نفیس کھانے، موٹر، ریل، ہوائی جہاز، سینما، تھیٹر، رقص گاہیں، ٹیلی فون، لاسلکی، غرضیکہ تفریح و تفنن، سہولیت و عیش پسندی کے حسین و جمیل اسباب میسر ہیں، ضروریاتِ زندگی کے اعلیٰ ترین معیار کے وسائل موجود ہیں لیکن اس گردو پیش، اس ماحول اس جنتِ ارضی میں پھرنے والا انسان، آہ بدنصیب انسان، اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں پر جب نگاہ ڈالتا ہے تو اسے اس میں اطمینان کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا! جو ایک مزدور کو مزدوری مل جانے کے وقت نصیب ہوتا ہے اس عالمگیر فقدان اطمینان و امنیت کے اسباب کو ڈھونڈنے کے لئے دنیا کے بہترین دماغ جمع ہوتے ہیں چھپا سٹھ اقوام عالم کے نمائندے سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں، دنیا کی نگاہیں ایک ماوا کی تلاش میں ان کی طرف

اگلی ہوتی ہیں مگر خبر آتی ہے،

نشستند و گفتند و برخاستند

کھوئے ہوئے اطمینان، لٹی ہوئی دولت اور غارت شدہ امن و سکون کی واپسی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اس میں شبہ نہیں کہ فنون لطیفہ کی ترقیاں تاریخ کو شرما رہی ہیں، ایک ہالی وڈ (فلم ساز خطۂ مقدس) میں ایک ہفتہ میں جس قدر خرچ ہوتا ہے، شاید مغلیہ سلطنت کے "رنگیلے" عمر بھر بھی اتنی دولت نہ دیکھ سکے ہوں کیلی جیون بلینیٹ کو چھ ہزار پونڈ فی ہفتہ تنخواہ مل رہی ہے، الیکو یہ سب کچھ سعدی مرحوم کی بوستان کی اس حکایت کی یاد دلاتا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ

خانہ از پائے بست ویراں است خواجہ در بند نقش ایوان است

مقصد اس تمام تشریح و تفصیل سے یہ نہیں کہ ان تمام خرابیوں کی ذمہ دار مادی ترقی ہے، اور ہم مادی ترقی کے مخالف ہیں، بلکہ صرف اس قدر کہ جو مادی ترقی اخلاق کو نظر انداز کر کے حاصل کی جائے گی اس کا لازمی اور فطرتی نتیجہ یہی ہوگا، اور جس دنیا میں خدا کی حکومت سے سرکشی ہوگی اس کی جنت میں بھی وہ آگ ہوگی کہ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ رہے ہونگے،

---*---

یہ ہے جناب پرویز کے مضمون کا ایک حصہ جو انھوں نے ۱۹۳۴-۳۵ء میں لکھا تھا۔ انھوں نے اپنے مضمون میں تین عنوان قائم کئے تھے۔

(۱) مذہب کو چھوڑ کر یورپ کی اخلاقی حالت کیا ہو گئی!

(۲) کیا اسلام مادی ترقی کا مانع ہے؟

(۳) اسلامی ترقی اور مغربی ترقی میں کیا فرق ہے؟

ہمارے اس مضمون کا تعلق چونکہ شق اول تک سے ہی ہے اس لئے ہم نے اتنا حصہ ہی نقل کیا ہے اس سے آپ نے اندازہ فرما لیا ہوگا۔ کہ یورپ کی اخلاقی حالت کیا ہو چکی تھی گذشتہ جنگ عظیم فی الواقع ان کے لئے تنذیر (WARNING) تھی۔ افسوس کہ انھوں نے اس سے عبرت حاصل کی اور آج ان کی یہ حالت ہو گئی۔ یورپ نے جس قدر مادی ترقی کی تھی اس کے اجتماعی محاصل آج جس بے دردی سے وہاں تباہ ہو رہے ہیں۔ کونسی آنکھ ہے جو اس پر خون فشاں نہیں انسان کے صدیوں سے جو علمی و مادی متاع